شمس الرحمٰن فاروقی

اردو کا ابتدائی زمانہ

ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو

کاپی رائٹ © شمس الرحمٰن فاروقی ۱۹۹۹

پہلا ایڈیشن: ۱۹۹۹

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 565 0623 (92-21)
ای میل: aaj@digicom.net.pk

فہرست

	دیباچہ	۹
باب اول	تاریخ، عقیدہ، اور سیاست	۱۱
باب دوم	تاریخ کی تعمیر نو، تہذیب کی تشکیل نو	۳۹
باب سوم	شروعات، وقفے، قیاسات	۶۱
باب چہارم	نظری تنقید، اور شعریات کا طلوع	۷۷
باب پنجم	وقفے، اور پھر حقیقی آغاز، شمال میں	۱۰۵
باب ششم	ولی نام کا ایک شخص	۱۲۵
باب ہفتم	نئے زمانے، نئی ادبی تہذیب	۱۴۱
	تحریریں، جن کا حوالہ دیا گیا	۱۷۹
	اشاریہ	۱۸۹

اردو کی سچی ادبی تہذیب اور ثقافت
کے مکمل ترجمان، اور اپنے بھائی

بلراج کومل
کی خدمت میں

حیفم آید کہ ترا جاے کنم در دل تنگ
یوسفے چوں تو سزاوار چنیں زنداں نیست

دیباچہ

شکاگو یونیورسٹی میں National Endowment for Humanities نامی ادارے کے تعاون سے ایک وسیع و عریض منصوبہ کئی سال ہوئے بنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہندوستان کی بڑی زبانوں کی ادبی تہذیب، ادبی اور ثقافتی تاریخ سے ان کے رشتوں، ان کے آپسی روابط، اور ادب کے بارے میں ان زبانوں میں رائج تصورات کا مطالعہ مقصود تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، مغرب میں بھی کوئی بسیط اور جامع کام اس موضوع پر نہیں ہوا ہے۔ قدیم و جدید ہندوستان میں ادب اور لسان اور اقتدار میں کس طرح کے رشتے وجود میں آئے؟ کوئی زبان "ادبی" زبان کس طرح اور کب بنتی ہے؟ کسی زبان میں ادب پیدا کرنے والوں کے مابین، اور ادب کو برتنے والوں کے مابین جو سلسلے قائم ہوتے ہیں، کیا ان کی نوعیت صرف طاقت پر مبنی ہوتی ہے، یا صرف بیع و شریٰ کے معاملات پر، یا کوئی تہذیبی آورش اور ثقافتی تعامل بھی اثر انداز ہوتا ہے؟

اس منصوبے کو Literary Cultures in Indian History کا نام دیا گیا، اور قدیم جدید بڑی ہندوستانی زبانوں کے ماہرین جمع کیے گئے، ہر ایک نے اپنے اختصاص کے اعتبار سے مضامین لکھے اور دوسروں کے مضامین پر اظہار رائے کیا۔ ہر مضمون کو انتہائی باریک بیں اور دور رس جرح و تعدیل کے عمل سے گذارا گیا۔ بحث اور سوال جواب کی روشنی میں ہر مضمون ایک سے زیادہ بار لکھا گیا۔ تجویز یہ ہے کہ ان مضامین کو ایک یا دو مجلدات کی شکل میں شائع کرایا جائے۔ ظاہر ہے کہ سب مضامین انگریزی میں ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر شیلڈن پالک (Sheldon Pollock) اس پورے پروگرام کے بانی ڈائریکٹر، اور سنسکرت ادب کے متعلق مقالے کے مصنف بھی ہیں۔

میرے ذمے Early Urdu پر مضمون لکھنے کا فریضہ تھا۔ اردو / ہندی کے معاملات کے سلجھائے بغیر Early Urdu کی اصطلاح بے معنی رہتی ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی بات جدید ہندی کے آغاز کی مخفی (اور ظاہر) سیاست اور اردو ادبی تہذیب پر اس کے اثر سے شروع کی۔ اس کے بعد میں نے اس سوال سے بحث کی کہ اردو زبان اگرچہ دہلی کے آس پاس پیدا ہوئی، لیکن اس میں ادب کی پیداوار اول اول گجرات اور دکن میں کیوں ہوئی۔ پھر گجرات اور دکن میں نظری تنقید اور شعریات کا طلوع، اس سلسلے میں امیر خسرو، اور سنسکرت کا مرکزی کردار زیر بحث آیا۔ اس کے بعد میں نے مندرجہ ذیل معاملات کی چھان بین کی: دہلی کا ادبی منظرنامے پر دیر میں ورود، لیکن دہلی کے ادبی سامراجی مزاج کے باعث غیر دہلی کے ادیبوں اور "باہر والوں" کا اردو کی فہرست استناد (Canon) سے اخراج، اور پھر اٹھارویں صدی کی دہلی میں نئی ادبی تہذیب اور شعریات کا آغاز۔

دہلی میں "اصلاح زبان" کی "مہم"، اور ایہام کی "تحریک" کی حقیقت کیا ہے؟ استادی / شاگردی کا ادارہ دہلی کے علاوہ کہیں اور کیوں نہ وجود میں آیا؟ ان سوالات، اور "دہلی اسکول" اور "لکھنؤ اسکول" پر بھی اس مقالے میں ایک حد تک کلام کیا گیا ہے۔

کوئی تین چار سال کی مشقت کے نتیجے میں میرا مضمون بڑھ کر ایک پوری کتاب بن گیا۔ اس کا مختصر کیا ہوا روپ شیلڈن پالک کی مرتبہ کتاب میں شائع ہوگا۔ اصل انگریزی کتاب، اور اس کا یہ ترجمہ، الگ سے کتابی شکل میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ میں اپنے دوست اجمل کمال کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اردو کتاب کی اشاعت اپنے ذمے کر لی۔ انگریزی کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نئی دہلی سے شائع ہو رہی ہے۔

جمیلہ نے حسب معمول میرے ہر کام کو اپنی توجہ سے آسان بنایا، لیکن وہاں کا معاملہ دردِ دل ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد،
۳۰ ستمبر ۱۹۹۹

باب اول

تاریخ، عقیدہ، اور سیاست

پرانے زمانے میں "اردو" نام کی کوئی زبان نہیں تھی۔ جو لوگ "قدیم اردو" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ لسانیاتی اور تاریخی اعتبار سے نادرست اصطلاح برتتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ "قدیم اردو" کی اصطلاح کا استعمال آج خطرے سے خالی نہیں۔ زبان کے نام کی حیثیت سے لفظ "اردو" نسبتاً نو عمر ہے۔ اور یہ سوال، کہ قدیم اردو کیا تھی، یا کیا ہے، ایک عرصہ ہوا تاریخ کے میدان سے باہر نکل چکا ہے۔ پہلے تو یہ سوال اردو / ہندی کی تاریخ کے بارے میں نو آبادیاتی، سامراجی مصلحتوں کے زیر اثر انگریزوں کی سیاسی تشکیلات کا شکار رہا۔ اور پھر جدید ہندوستان میں ہندوستانی (= ہندو) تشخص کے بارے میں سیاسی اور جذباتی تصورات کی دنیا میں داخل ہو گیا۔

زمانۂ حال کے عام ہندی بولنے والے کے لیے یہ خیال اب عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس زبان کو وہ آج "ہندی" کے نام سے جانتا ہے، وہ قدیم الایام سے موجود ہے، اور اس کے ادب کا آغاز (اگر اور بھی پہلے نہیں تو) کم از کم خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵) سے ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے لوگوں کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ کبھی اٹھارویں صدی میں پرانے زمانے کی یہ اصلی "ہندی" یا "ہندوی" اس وقت "اردو" بن گئی جب مسلمانوں نے "فیصلہ" کیا کہ وہ اپنے زمانے کی راج "ہندی" کی راہ سے ہٹ کر ایک بھاری، فارسی زدہ زبان اختیار کریں گے۔ اور پھر یہ زبان، ہندوستانی مسلمانوں کا مابہ الامتیاز بن گئی۔ (۱)

(۱) زمانۂ حال میں اس نظریے کو سب سے زیادہ تفصیل اور بسط کے ساتھ امرت رائے نے اپنی کتاب *A House Divided: The Origin and Development of Hindi/Hindavi* (نئی دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴) میں بیان کیا۔ امرت رائے کا نظریہ تضادات سے پر ہے، اور اس کی بنیاد متعصبانہ ظن و تخمین پر ہے، نہ (بقیہ اگلے صفحے پر)

ہندی / اردو ادب کی عالمانہ تاریخ کے نام سے آج کل جو مفروضات ہمارے ملک میں رائج ہیں، ان کا خاصا حصہ صرف نام زدگی کے اتفاق پر مبنی ہے۔ ہم لوگ اس بات کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ جس زبان کو آج ہم "اردو" کہتے ہیں، پرانے زمانے میں اسی زبان کو "ہندوی"، "ہندی"، "دہلوی"، "گجری"، "دکنی"، اور پھر "ریختہ" کہا گیا ہے۔ اور یہ نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس ترتیب سے میں نے انھیں درج کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زبان کا وہ روپ جو دکن میں بولا اور لکھا جاتا تھا، اسے سترہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے تقریباً وسط تک "دکنی" ہی کہتے تھے۔ اور شمال میں ایک عرصے تک "ریختہ" اور "ہندی"، دونوں ہی اس زبان کے نام کی حیثیت سے ساتھ ساتھ استعمال ہوتے رہے۔

انگریزوں نے اس زبان کے لیے اپنی ایجاد، یا پسند، کے نام استعمال کیے۔ اکبر کے دربار میں ایلچی بھیجا اول کے ایلچی سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) کے ساتھی ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) نے اپنی کتاب *A Voyage to East India* (لندن، ۱۶۵۵) میں اس زبان کو "اندوستان" (Indostan) کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اندوستان" بڑی جان دار زبان ہے، اور یہ کم سے کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ ڈالنے پر قادر ہے۔ اس کی لفظیات میں عربی اور فارسی کی کثرت ہے، لیکن اس کا طرز تحریر، عربی فارسی سے مختلف ہے۔(۲)

(۲) Edward Terrry: *A Voyage to East India*، مطبوعہ لندن، ۱۶۵۵۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

کہ ٹھوس حقائق پر۔ لیکن اردو والوں نے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب تا حال نہیں دیا ہے۔ اس دوران اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ میں شائع ہوا، جس میں اس کا ذیلی عنوان *Origin and Development of Hindi/Urdu* کر دیا گیا ہے۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق اہل اردو میں صرف مرزا خلیل احمد بیگ نے امرت رائے کا رد لکھا، لیکن وہ پوری طرح کارگر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اپنی زبان کے آغازی سرچشموں کے بارے میں خود اردو والوں کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون "امرت رائے اور ہندی اردو کا مسئلہ"، مشمولہ مرزا خلیل احمد بیگ: "لسانی تناظر"، نئی دہلی، باہری پبلی کیشنز، ۱۹۹۷۔

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ امرت رائے کا نظریہ دراصل ان کا نہیں، بلکہ ان کے والد نامدار پریم چند کے خیالات پر مبنی ہے۔ پریم چند کے یہاں امرت رائے کے نظریے کی اولیں، اور نرم صورت ملتی ہے۔ آریہ بھاشا سمیلن (لاہور، ۱۹۳۶) کے سامنے پریم چند نے جو خطبہ دیا، اس میں انھوں نے فرمایا، "مسلمانی زمانے میں اوشیہ [یقیناً] ہی ہندی کے تین روپ ہوں گے۔ ایک تو ناگری لپی [رسم خط] میں ٹھیٹھ ہندی، دوسری اردو، یعنی فارسی لپی میں لکھی ہوئی فارسی سے ملی ہندی، اور تیسری برج بھاشا... مسلمانوں کی سنسکرتی [تہذیب] ایران اور عرب کی ہے۔ اس کا زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عربی اور فارسی شبد [لفظ] اس میں آ آ کر ملنے لگے، یہاں تک کہ آج ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں سی ہو گئی ہیں۔" پریم چند کی اس تحریر کی طرف میری توجہ مالک رام کے ایک مضمون کے ذریعے منعطف ہوئی۔ یہ مضمون "ہماری زبان" نئی دہلی کی اشاعت مورخہ یکم جولائی ۱۹۹۷ کے صفحہ اول پر شائع ہوا ہے۔ یہاں میں نے پریم چند کی اصل عبارت ان کی کتاب "کچھ وچار"، مطبوعہ سرسوتی پریس، الہ آباد، ۱۹۹۷، ص ص ۷۴ تا ۷۵ سے نقل کی ہے۔ پریم چند کو شاید احساس نہ تھا کہ ان کی باتوں میں شر و فساد کے کتنے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ورنہ اردو ہندی کے معاملے میں ان کا عام رویہ معتدل اور منصفانہ تھا۔ ملاحظہ ہوں باب دوم کے حواشی نمبر ۴۰ اور ۴۱۔

انگریزوں نے اور نام جو اس زبان کے لیے استعمال کیے، ان میں حسب ذیل شامل ہیں: Moors, Hindoostanic, Hindoostanee, Indostans آخر الذکر، یعنی Indostans کے وجود کا سراغ *Oxford English Dictionary* سے ملتا ہے۔ باقیوں سے ہماری ملاقات اس تحریر کے دوران ہو گی۔ اگر "ہندوستانی" کو مستثنیٰ کر دیں، تو انگریزوں کے دیے ہوئے متذکرہ بالا ناموں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے کسی اردو بولنے والے نے استعمال کیا ہو، یا اگر استعمال نہ بھی کیا ہو تو اس سے آشنا رہا ہو۔ یہ سب نام انگریزوں نے اپنی لاعلمی یا سیاسی ضرورتوں کے باعث ایجاد کیے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، شمال میں "ریختہ" اور "ہندی"، ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے یکساں مقبول تھے۔ یہ حالت اٹھارویں صدی تک رہی۔ وسط انیسویں صدی سے زبان کے نام کی حیثیت سے "ہندی" کو "ریختہ" پر ترجیح دی جانے لگی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ انیسویں صدی میں بول چال کی زبان کو تقریباً ہمیشہ "ہندی" ہی کہا جاتا تھا، جب کہ اٹھارویں صدی میں "ریختہ" کو بول چال کی زبان کے لیے بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ میر کا شعر ہے (دیوان اول، قبل ۱۷۵۲):

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے (۳)

انیسویں صدی کے تقریباً آخر تک "ہندی" اور "اردو" دونوں ہی نام مروج رہے۔ آہستہ آہستہ "ریختہ" بطور اسم زبان کا چلن گھٹتا گیا۔ اور بیسویں صدی کے اوائل تک بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جہاں لفظ "ہندی" کو "اردو" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔(۴) "ہندوی" کا بھی استعمال اٹھارویں صدی کے اواخر تک رہا۔ چنانچہ مصحفی کے دیوان اول (تاریخ ترتیب تقریباً ۱۷۸۵) میں ہے:

بحوالہ Bernard Cohn, "The Command of Language and the Language of Command" مشمولہ Ranjit Guha(Ed.) : *Subaltern Studies, IV, Writings on South Asian History and Society* مطبوعہ نئی دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ [۱۹۸۵]، ص ۳۰۰۔

(۳) میر، "کلیات"، جلد اول، مرتبہ ظل عباس، دہلی، علمی مجلس، ۱۹۶۸، ص ۳۰۱۔

(۴) مثال کے طور پر، "اسرار خودی" میں اقبال کے شعر ہیں:

ہند یم از پارسی بیگانہ ام — ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسن انداز بیاں از من مجو — خوانسار و اصفہاں از من مجو
گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرز گفتار دری شیریں تر است

ظاہر ہے کہ یہاں "ہندی" سے "اردو" ہی مراد ہے۔ "اسرار خودی" پہلی بار ۱۹۱۵ میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے یہ اشعار "کلیات اقبال فارسی" مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۸، کے صفحہ ۱۱ سے نقل کیے ہیں۔ ان اشعار کی طرف متوجہ کرنے کے لیے میں مرزا خلیل احمد بیگ کا ممنون ہوں۔

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج (۵)

زبان کے نام کی حیثیت سے لفظ "اردو" پہلی بار ۱۷۸۰ کے آس پاس استعمال ہوا۔ اتفاق یہ کہ اولین استعمال کی تمام، یا تقریباً تمام، قدیم مثالیں مصحفی ہی کے یہاں ہیں۔ دیوان اول ہی میں ہے:

البتہ مصحفی کو ہے ریختے میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا (۶)

اغلب ہے کہ یہاں لفظ "اردو" سے "شاہجہاں آباد کا شہر" مراد ہے، نہ کہ "اردو زبان"۔ فقرہ "اردو کی زبان" کے معنی وہ زبان سمجھنا جس کا نام "اردو" ہے، اسی وقت صحیح ہوگا جب یہ یقینی ہو کہ لفظ "اردو" کو "شاہجہاں آباد" کے معنی میں نہیں استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے، شمال کے لوگ عرصۂ دراز تک "اردو" کو "شاہجہاں آباد" کے معنی میں بولتے تھے۔ اور "زبان اردو" سے بعض اوقات "فارسی" بھی مراد لی گئی ہے۔ خیر، مصحفی کے دیوان چہارم (مرتبہ تقریباً ۱۷۹۶) میں جو استعمال ہے وہ صاف طور پر "اردو زبان" کے معنی میں ہے۔ لکھنؤ والوں کی شکایت میں مصحفی ایک مخمس میں کہتے ہیں:

ہر جائے گوش چشم بنا ناک کان کو
اپنی زبان سمجھے ہیں اردو زبان کو (۷)

علامہ حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون "اردو زبان اور اس کے مختلف نام" [اول طباعت، مئی ۱۹۲۹] میں مصحفی کا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے (۸)

بظاہر یہاں "مرزا" سے مراد مرزا محمد رفیع سودا ہیں۔ سودا کا انتقال جون ۱۷۸۱ میں ہوا۔ لہٰذا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعر جون ۱۷۸۱ کے پہلے کا ہوگا۔ لیکن کتنا پہلے کا، یہ بات صاف نہیں ہوتی۔ نیر کاکوروی نے "نور اللغات" جلد اول (اول طباعت ۱۹۲۴) میں لفظ "اردو" بطور اسم زبان کی سند میں یہی شعر نقل کیا

(۵) مصحفی: "کلیات مصحفی"، جلد اول، مرتبہ نور الحسن نقوی، دہلی، مجلس اشاعت ادب، ۱۹۶۷، ص ۹۱۔
(۶) مصحفی، "کلیات"، جلد اول (نقوی)، ص ۳۸۔
(۷) مصحفی، "کلیات"، جلد دوم، مرتبہ حفیظ عباسی، دہلی، مجلس اشاعت ادب، ۱۹۶۹، ص ۵۷۸۔
(۸) علامہ حافظ محمود شیرانی: "مقالات شیرانی"، جلد اول، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶، ص ۴۱۔

ہے۔ (۹) حوالہ دونوں ہی حضرات نے نہیں دیا۔ مصحفی کے وسیع و عریض مطبوعہ کلام میں مجھے یہ شعر نہیں ملا۔ نہ ہی یہ مصحفی کے "دیوان قصائد"، مرتبہ نور الحسن نقوی، کی پریس کاپی میں ملا۔ (یہ دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی اشاعت مجلس ترقی ادب لاہور سے متوقع ہے۔) اغلب ہے شیرانی مرحوم نے یہ شعر "نور اللغات" میں دیکھا ہو۔ لیکن وہ بہت محتاط محقق تھے، انھوں نے کسی اور ذریعے سے بھی اس بات کی تصدیق کر لی ہوگی کہ یہ شعر مصحفی کا ہی ہے۔ ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جو مخطوطے مصحفی کے ہیں، اور جو شیرانی صاحب کی دسترس میں یقیناً تھے، ان میں یہ شعر انھیں ملا ہو۔

ہو سکتا ہے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کچھ ایسا کلام اب بھی ہو جو نور الحسن نقوی اور حفیظ عباسی دونوں سے چھوٹ گیا ہو، لیکن اس وقت کسی مصدقہ حوالے کے بغیر شعر زیر بحث کو مصحفی کی ملکیت ماننے میں تھوڑا سا تامل ضرور ہے۔ بہر حال، اگر اس شعر میں سودا کے ذکر کا مطلب یہ نکالا جائے کہ سودا اس وقت زندہ تھے، تو یہ شعر ۱۷۷۰ کے آس پاس سے لے کر جون ۱۷۸۱ کے درمیان کہا گیا ہوگا۔ "۱۷۷۰ کے آس پاس" میں نے اس لیے کہا کہ مصحفی کی پیدائش ۱۷۵۰ کی ہے، اور انھوں نے اغلباً سترہ اٹھارہ کی عمر میں باقاعدہ شعر گوئی آغاز کی ہوگی۔ لیکن یہ بھی ہے کہ مصحفی کا لکھنؤ میں پہلا ورود ۱۷۷۲ کے آس پاس کا ہے۔ سودا اس وقت وہاں موجود تھے، لیکن میر ابھی دلی ہی میں تھے۔ مصحفی کا پہلا سفر دہلی ۱۷۷۳ کا ہے، اور شاید اس وقت وہ میر سے پہلی بار ملے ہوں۔ لہٰذا یہ شعر ۱۷۷۱ اور ۱۷۷۳ کے درمیان کا ہو سکتا ہے۔ (۱۰)

ایک بات مگر یہ بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ مصحفی کے شعر زیر بحث میں "خدا رکھے" کا فقرہ

(۹) نور الحسن نیر کاکوروی، "نور اللغات"، جلد اول، نیر پریس لکھنؤ، ۱۹۲۴، ص ۲۶۵۔
(۱۰) جمیل جالبی نے اپنی "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، مطبوعہ دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۷، کے ص ۶۶۱ پر میر محمدی مائل کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ اس کی تاریخ وہ قبل ۱۷۶۲ قرار دیتے ہیں۔ اس قطعے کے تین شعروں میں لفظ "اردو" اسم لسان کے طور پر تین بار آیا ہے۔ لیکن مجھے اس بات میں سخت شک ہے کہ یہ قطعہ واقعی میر محمدی مائل کا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کا انداز خاصا بوجھل اور مصنوعی ہے، گویا یہ اشعار کہے نہیں، بلکہ گڑھے گئے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ان میں شاہ جہاں کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے، وہ غیر تاریخی ہے، اور میر امن کے ان بیانات سے ملتی جلتی ہے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔ آخری بات یہ کہ قطعے میں کہا گیا ہے کہ "ہندی" بطور اسم لسان اب (یعنی وسط اٹھارویں صدی میں) بالکل غائب ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ مائل کے شعر ہیں:

بولے وہ سن کے اردو کا میں پوچھتا تھا حال
تم کھول بیٹھے پترہ اس شہر کا بھلا
مشہور خلق اردو کا تھا ہندوی لقب
اگلے سفینوں بیچ یہ لکھ گئے ہیں سب ملا
شاہ جہاں کے وقت سے خلقت کے بیچ میں
ہندوی تو [نام] مٹ گیا اردو لقب چلا

(بقیہ اگلے صفحے پر)

"میر و مرزا" کے لیے نہیں، بلکہ "زبان اردو" کے لیے ہو سکتا ہے۔ پھر اس صورت میں اس شعر کی تاریخ تحریر کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ دیوان سوم (مرتبہ تقریباً ۱۷۹۴) اور دیوان ششم (مرتبہ تقریباً ۱۸۰۹) میں مصحفی کے شعر ہیں:

یہ ریختے کا جو اردو ہے مصحفی اس میں — نئی نکالی ہیں باتیں ہزار ہم نے تو
واقف نہیں زبان سے اردو کی تس پہ آہ — کیا کیا عزیز کرتے ہیں اشعار کا گھمنڈ (۱۱)

پہلا شعر دیوان اول کا ہے، اس میں لفظ "اردو" کو مذکر باندھا گیا ہے۔ پھر "ریختے کا اردو" میں دونوں لفظ اسم زبان کے معنی میں نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ "اردو" سے یہاں مراد "شہر، قلعہ" ہے، نہ کہ وہ زبان جسے ہم آج "اردو" کہتے ہیں۔ دوسرے شعر میں صاف ظاہر ہے کہ "اردو" سے شہر دہلی مراد ہے۔ یعنی انیسویں صدی کے آغاز میں بھی مصحفی نے لفظ "اردو" کو "شہر دہلی" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

مندرجہ بالا محاکمے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کے نام کے طور پر لفظ "اردو" کا استعمال اٹھارویں صدی کے ربع آخر کے پہلے نہیں ملتا۔ زبان کے نام کے طور پر اس لفظ (اردو) کی زندگی غالباً "زبان اردوے معلاے شاہجہاں آباد" کی شکل میں شروع ہوئی۔ اور اس سے مراد تھی "شاہجہاں آباد کے شہر معلّیٰ / قلعۂ معلّیٰ / دربار معلّیٰ کی زبان"۔ ایسا لگتا ہے کہ شروع شروع میں اس فقرے سے ہماری اردو زبان نہیں، بلکہ فارسی مراد لی جاتی تھی۔ مرور ایام کے ساتھ یہ فقرہ مختصر ہو کر "زبان اردوے معلّیٰ"، پھر "زبان اردو"، اور پھر "اردو" رہ گیا۔ "ہابسن جابسن" کے مصنفین نے ۱۵۶۰ کا ایک حوالہ "اردو بازار" کی سند میں نقل کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان میں لفظ "اردو" کا ورود بابر کے ساتھ ہوا، اور یہ کہ بابر کی لشکر گاہ کا نام "اردوے معلّیٰ" تھا، اور وہ زبان جو اس لشکر گاہ کے نواح میں پیدا ہوئی، "زبان اردوے معلّیٰ" کہلائی۔ (۱۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لفظ "اردو" بطور اسم لسان کی تحقیق میں احتیاط سے شاید کام نہیں لیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ خان آرزو کی "نوادر الالفاظ" اور تحسین کی "نو طرز مرصع" میں لفظ "اردو" اسم زبان کے طور پر برتا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہی کتابوں میں لفظ "اردو"، زبان کے نام کے طور پر نہیں، بلکہ "شہر دہلی" کے معنی میں ہے۔

(۱۱) مصحفی، "کلیات"، جلد سوم، مرتبہ نور الحسن نقوی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱، ص ۲۶۱، اور "کلیات"، حصۂ سوم، مرتبہ حفیظ عباسی، دہلی، مجلس اشاعت ادب، ۱۹۷۵، ص ۷۹۔

(۱۲) Henry Yule and A.C.Burnell: *Hobson Jobson, A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words, Phrases, and of Kindred Terms, Etymological, Historical, Geographical, and Discursive.* مطبوعہ نئی دہلی، روپا اینڈ کو، ری پرنٹ ایڈیشن، ۱۹۸۶ [اول اشاعت، ۱۸۸۶، اشاعت ثانی، مع اضافہ، ۱۹۰۲]۔

یول اور برنیل صاحبان (مصنفین "ہابسن جابسن") کی سند تو یقیناً درست ہے، لیکن اس پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ صریحاً غلط باتوں پر مبنی ہے۔ پہلی بات تو کہ بابر کے پہلے بھی ہندوستان میں ترکوں کی کمی نہ تھی۔ لہٰذا لفظ "اردو" کے ورود کو بابر کی آمد سے منسلک کرنا غیر ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ بابر نے کبھی بھی دہلی میں طویل عرصے تک قیام نہ کیا۔ تیسری بات یہ کہ "ہندی / ہندوی / دہلوی" نام کی زبان دہلی اور اس کے نواح میں بابر کے بہت پہلے سے موجود تھی۔ شمالی ہند میں مغلوں کی آمد کے نتیجے میں وہاں کوئی نئی زبان بالکل نہ پیدا ہوئی۔

اٹھارویں صدی آتے آتے، بلکہ شاید اس سے کچھ پہلے ہی، لفظ "اردو" کو "شہر دہلی / شاہجہاں آباد، خاص کر فصیل بند شہر" کے معنی میں عام طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اور یہ مفہوم کم سے کم اوائل انیسویں صدی تک رائج رہا۔ انشا اور قتیل نے "دریاے لطافت" (۱۸۰۷) میں لکھا کہ "مرشد آباد اور عظیم آباد کے لوگ اپنے حسابوں اردو کے اہل زبان ہیں، اور اپنے شہر کو 'اردو' قرار دیتے ہیں"۔ (۱۳) ان کا مطلب یہ ہے کہ عظیم آبادی اور مرشد آبادی خود کو کچھ بھی سمجھیں، لیکن وہ "اردو"، یعنی شاہجہاں آباد کے اصل باسی نہیں ہیں۔ اسی طرح، میر امن نے جہاں کہیں "اردو کی زبان" لکھا ہے تو اس سے ان کی مراد "شاہجہاں آباد کی زبان" ہے۔ مصحفی کی مثال ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وہ لفظ "اردو" سے "شہر شاہ جہاں آباد" مراد لیتے ہیں۔ آگے چل کر انیسویں کے اواخر تک لکھے ہوئے اردو لغات روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ ان لغات کے مصنفین کی نظر میں "اردو" کے مقبول ترین معنی "شہر شاہ جہاں آباد" ہی ہیں۔

اگرچہ مغل شاہی خاندان کے بہت سے افراد، اور بابر خود، تھوڑی بہت "ہندی" جانتے تھے، اور بعد کے سلاطین و شاہان مغلیہ کم سے کم ایک ہندوستانی زبان سے بخوبی واقف تھے، "ہندی" (یعنی آج کی اردو) کو دربار مغلیہ کی (غیر سرکاری، سرکاری زبان تو وہ کبھی بن ہی نہ سکی) زبان بنتے بہت دیر لگی۔ غیر سرکاری زبان کا رتبہ بھی اس کے لیے اسی وقت ممکن ہو سکا جب شاہ عالم ثانی (زمانۂ حکومت ۱۷۵۹ تا ۱۸۰۶) نے جنوری ۱۷۷۲ میں دلی کو مراجعت کی۔ دربار کی سرکاری زبان تو پھر بھی فارسی رہی، لیکن شاہ عالم بہت دن الٰہ آباد میں رہا تھا، اور اسے "ہندی" سے یک گونہ لگاؤ بھی تھا، اس لیے غیر رسمی طور پر وہ نہ صرف یہ کہ "ہندی" میں گفتگو کرتا تھا، بلکہ وہ اس زبان کا اچھا خاصا مصنف بھی تھا۔ اپنی تصنیف کردہ داستان "عجائب القصص"

---

(۱۳) انشاء اللہ خاں انشا، اور مرزا محمد حسن قتیل: "دریاے لطافت"، مرشد آباد، مطبع آفتاب عالم تاب، ۱۸۵۰، ص ۱۱۶۔ چونکہ اس کتاب کا بڑا حصہ، خاص کر وہ جس کا تعلق لسانیات سے ہے، انشا نے لکھا تھا، لہٰذا لوگ سہولت کے لئے عام طور پر پوری "دریاے لطافت" کو انشا کی تصنیف بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے لسانیاتی عنصر کے حوالے دیتے وقت میں بھی اسی طریق عمل کی پابندی کروں گا۔

میں اس نے اس داستان کی زبان کا نام "ہندی" ہی لکھا ہے۔ شاہ عالم نے یہ کتاب ۱۷۹۲/ ۱۷۹۳ میں لکھنا آغاز کی، لیکن اسے نامکمل ہی چھوڑ دیا۔ شاید بینائی سے محروم ہونے کے باعث اس کا لکھنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ پھر بھی جتنا متن داستان اس نے چھوڑا ہے، وہ کوئی چھ سو صفحات کو محیط ہے۔(۱۴)

خان آرزو (۱۶۸۷/ ۱۶۸۸ تا ۱۷۵۶) نے ۱۷۴۷ سے ۱۷۵۲ کے زمانے میں "نوادر الالفاظ" تصنیف کی۔ یہ دراصل عبدالواسع ہانسوی کی اردو فرہنگ "غرائب اللغات" (مصنفہ تقریباً ۱۶۹۰) پر مفصل تنقید ہے، جو خود مستقل لغت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ "نوادر" میں خان آرزو نے جگہ جگہ "اردو"، یا "اردوے معلیٰ" لکھ کر "دہلی" مراد لیا ہے۔ مثلاً لفظ "چھنیل" پر استدراک کرتے ہوئے خان آرزو لکھتے ہیں، "ہم لوگ، جو علاقۂ ہند کے ہیں، اور اردوے معلیٰ میں رہتے ہیں، اس لفظ سے واقف نہیں ہیں۔"(۱۵) اپنی معرکہ آرا تصنیف "مثمر" (زمانۂ تصنیف تقریباً ۱۷۵۲) میں خان آرزو نے فارسی زبان کے قدیم ناموں "پہلوی" اور "دری" سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظ "در" سے "در ملوک و سلاطین" اور لفظ "پہلو" سے "اردو" (یعنی شہر بادشاہ) مراد ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> لہٰذا یہ بات بالکل ثابت ہے کہ اردو کی زبان افصح زبان ہے۔ اسی جگہ کی فارسی معتبر ہے۔ اور اس سے خاص شعر و انشا کی زبان مراد نہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہر ملک کے مختلف شہروں کے شعرا، مثلاً شروان کے خاقانی، گنجہ کے نظامی، غزنین کے سنائی، اور دہلی کے خسرو، اسی مستند زبان میں حرف زنی کرتے تھے۔ اور یہ زبان، اور کوئی نہیں، اردو کی زبان ہے۔ الا ماشاء اللہ، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔(۱۶)

لہٰذا یہ بات ظاہر ہے کہ ۱۷۵۰ کے آس پاس (کم سے کم) اشرافیہ طبقے میں "زبان اردوے معلیٰ" سے وہ زبان ہرگز مراد نہ تھی جسے ہم آج "اردو" کے نام سے جانتے ہیں۔ میر نے البتہ ریختہ کی شاعری کو اردوے

(۱۴) شہنشاہ شاہ عالم ثانی: "عجائب القصص"، مرتبہ راحت افزا بخاری، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵، ص ۲۶۔

(۱۵) سراج الدین علی خان آرزو: "نوادر الالفاظ"، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۹۲[۱۹۵۱] ص ۲۱۴، [متن]۔ میں نے "نوادر" سے جتنے حوالے دیے ہیں، ان کا مقابلہ اس مخطوطے سے کر لیا ہے جو فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں تھا، اور اب قومی آرکائیوز، نئی دہلی، میں محفوظ ہے۔

(۱۶) خان آرزو: "مثمر"، مرتبہ ریحانہ خاتون، کراچی، انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۱، ص ۱۳ (متن)۔ مزید ملاحظہ ہو، ڈاکٹر سید عبداللہ، "نوادر الالفاظ"، دیباچہ، ص ص ۳۱ تا ۳۲۔

معلیٰ شاہجہاں آباد کی زبان میں شاعری قرار دیا تھا، لیکن اس کے وجوہ اور تھے۔ (۱۷) رہا سوال "اردو" اور "اردوے معلیٰ" کا، تو یہ الفاظ اسم زبان کے طور پر اس وقت تک استعمال میں بھی نہ تھے۔ ہماری زبان (یعنی وہ زبان جسے ہم آج اردو کہتے ہیں) کا نام شاہ عالم کے لیے "ہندی" تھا، اور اسے شاہ عالم نے قلعے میں لا کر اشراف کے لیے عزت دار بنایا۔ وہ (بشمول سنسکرت) کئی زبانیں جانتا تھا۔ اسے "ہندی" سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اس کے مربیوں میں تھا، اور وہ خود اس زبان میں مشق سخن کرتا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر، اور اس لیے کہ وہ اسے دربار میں غیر رسمی طور پر استعمال کرتا ہوگا، "ہندی" کو تمام شمالی ہند میں توقیر نصیب ہوئی۔ اس میں بہت کم شک ہے کہ یہ ۱۷۷۰ کی دہائی رہی ہوگی جب فقرہ "زبان اردوے معلیٰ" کے معنی "فارسی" کے بجائے "ہندی" سمجھے جانے لگے۔ اور میرا خیال ہے کہ "زبان اردوے معلیٰ" کو عام طور پر فارسی کی جگہ "ہندی" کہلاتے کہلاتے ۱۷۹۰/ ۱۷۹۵ کا زمانہ ضرور آ گیا ہوگا۔

گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ میں "Hindoostanee Language" کی ایک "Grammar" شائع کی۔ اس کتاب کا نواں باب اس نے عروض کے لیے مختص کیا، اور لکھا کہ میں مثال کے لیے "بہترین شعرا کے مختلف قسم کے اشعار سے نمونے پیش کروں گا۔ یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے اپنی کئی تصنیفات اس ملواں بولی میں لکھی ہیں جسے 'اردو' بھی کہا جاتا ہے، یعنی دربار کی شستہ زبان۔ اور جو آج بھی، کم و بیش اپنی اصل شکل میں، ایک زمانے میں انتہائی طاقت ور اس سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بھی چھائی ہوئی ہے"۔(۱۸)

خان آرزو نے سنسکرت کے لیے "ہندی کتابی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اپنی طویل مثنوی "نہ سپہر" (مصنفہ ۱۳۱۷/ ۱۳۱۸) میں امیر خسرو نے اسے "سنسکرت" ہی کہا ہے، اور لکھا ہے:

(۱۷) میر نے "نکات الشعرا" (۱۷۵۲) میں لکھا ہے کہ ریختہ کا فن "فارسی کے طرز میں، اور اردوے معلاے شاہجہاں آباد کی زبان میں شاعری" کا فن ہے۔ ("نکات الشعرا"، مرتبہ محمود الٰہی، مطبوعہ دہلی، ادارۂ تصنیف، ۱۹۷۲، ص ۲۳)۔ اس بیان کے ذریعے ہمیں اس تناؤ کی طرف اشارہ ملتا ہے جو اس زمانے میں "ہندی/ ریختہ" اور فارسی کی ادبی صورت حال کی تہ میں موجود تھا۔ میر کا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے بجائے "ہندی/ ریختہ" کو بمرتبۂ اول دلی کی ادبی زبان قرار دیں، لیکن وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ ریختہ کی شاعری فارسی کے طرز پر ہی ہے۔ ایک طرح دیکھیں تو میر "عوامی" موقف کا اظہار کر رہے ہیں، اور خان آرزو کا موقف "علمی" اور "اشرافی" ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میر کے اس بیان کی تہ میں خان آرزو اور ان کے درمیان معاندت کارفرما ہو۔ مزید ملاحظہ ہو، خان آرزو کا بیان کہ "ریختہ" کی شاعری "ہندی اہل اردوے ہند" کی شاعری ہے، بطرز فارسی۔ (حاشیہ ۲۸)۔

(۱۸) John Gilchrist: *A Grammar of the Hindoostanee Language, or Part Third of Volume First, of a System of Hindoostanee Philology*, Calcutta, at the Chronicle Press, 1796, page 261.

> یہ ایک خاص طرح کی زبان ہے، اس کا علم برہمنوں کے لیے ضروری ہے۔ ازمنۂ قدیم سے اس کا نام سنسکرت ہے۔ عام لوگ اس کے کن مکن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، صرف برہمن ہی جانتے ہیں۔ اور سب برہمن بھی اسے اتنی خوبی سے نہیں جانتے کہ اس میں گفتگو کر سکیں، یا اس میں شعر موزوں کر سکیں۔(۱۹)

چونکہ قدیم شمالی ہند میں ناگری رسم الخط برہمنوں کے علاوہ شاید کسی کی دسترس میں نہ تھا، اس لیے کائستھ جب پندرہویں صدی میں برہمنوں سے الگ ہوئے تو انھوں نے اپنے لیے "کیتھی" رسم الخط ایجاد کیا۔ یہ ناگری پر مبنی تھا اور شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی تک رائج رہا۔(۲۰) چونکہ شمالی ہند میں کوئی ایسا رسم الخط موجود نہ تھا جو خاص و عام میں مقبول ہو، اور ہر جگہ استعمال بھی ہوتا ہو، اس لیے اغلب ہے کہ شروع شروع میں شمالی ہند کی نئی ابھرتی ہوئی زبانوں کا ادب زبانی ہی رہا ہو۔ ہندی / ہندوی / دہلوی کی خوش قسمتی تھی کہ اسے روز اول ہی سے فارسی رسم الخط بہم تھا۔ یہ اس لیے ہوا کہ اس زبان کا ادبی استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا۔ یہ لوگ خود صوفی تھے، یا امیر خسرو کی طرح صوفیوں سے منسلک تھے۔

نو آبادیاتی سطح پر اٹھارویں صدی کے اواخر میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو معاملات رہے، ان میں انگریزوں نے دیکھا کہ "ہندی" ہی ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ لیکن انھوں نے "ہندی / ہندوی" کی جگہ اس زبان کو "ہندوستانی" کا نام دینا چاہا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستان کی مقبول ترین زبان کا نام "ہندوستانی" ہی انھیں زیادہ منطقی اور قواعدی معلوم ہوتا ہوگا — جیسے انگلستان کی اول زبان کا نام انگریزی تھا، فرانس کی اول زبان کا فرانسیسی، جرمنی کی اول زبان کا نام جرمن تھا، وغیرہ۔ دوسری بات یہ تھی کہ اسم زبان کے طور پر اس زبان کا نام "ہندوستانی" بالکل لا معلوم بھی نہ

(۱۹) امیر خسرو: "مثنوی نہ سپہر" (تاریخ تحریر، ۱۳۱۷/ ۱۳۱۸)، مرتبہ وحید مرزا، مطبوعہ Oxford University Press, for the Islamic Research Association, Calcutta, 1948 (Persian Side), 1949 (English side), ص ۱۸۰۔

(۲۰) انیسویں صدی میں کیتھی کے نشیب و فراز کی تفصیلات کے بارے میں دیکھیے: Christopher King: *One Language, Two Scripts, The Hindi Movement in Nineteenth Century India* مطبوعہ بمبئی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴۔ کیتھی رسم الخط سے آج شاید ہی کوئی واقف ہو۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ رسم خط موجودہ بہار، یوپی، اور مدھیہ پردیش کے خاصے بڑے علاقے میں رائج تھا۔ ناگری رسم خط کو فروغ دینے کی سرکاری انگریزی پالیسی نے کیتھی کا قلع قمع کر دیا۔

تھا۔ (علامہ سید سلیمان ندوی نے اس نام کا حدوث سولہویں اور سترہویں صدی کی فارسی تصنیفات میں دریافت کیا ہے)۔(۲۱) ہاں یہ ضرور ہے کہ اسم زبان کی حیثیت سے "ہندوستانی" کو کبھی وہ مقبولیت نہ حاصل ہوئی جو "ہندی" یا "ریختہ" کو حاصل تھی۔ اسم زبان کی حیثیت سے لفظ "ہندوستانی" فارسی کے کسی بڑے لغت میں نہیں ملتا۔

لیکن انگریزوں کی تحریروں اور حکمت عملی میں "ہندوستانی" کو "ہندی / ہندوی" پر بحیثیت اسم زبان ترجیح کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اس زبان کو صرف مسلمانوں سے مختص قرار دیا۔ وہ "ہندی" زبان کو "ہندوؤں کی زبان"، اور ایک الگ طرح کی زبان قرار دینے پر مصر تھے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ زبان، جسے ریختہ یا ہندی کہا جاتا ہے، سارے ہندوستان میں بولی جاتی ہے، اور اگر ہر جگہ بولی نہیں تو سمجھی ضرور جاتی ہے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ یہ زبان ہے مسلمانوں کی۔ مصنفین "ہابسن جابسن" کا بیان میں انھیں کے لفظوں میں نقل کرتا ہوں، تاکہ ترجمے کے باعث کسی بات کے مسخ ہو جانے کا امکان نہ رہے:

> **Hindustani**, properly an adjective, but used substantively in two senses, *viz*, (a) a native of Hindustan, and (b), (*Hindustani zaban*) 'the language of the country' but in fact the language that the Mahommedans of Upper India, and eventually the Mahommedans of the Deccan, developed out the Hindi dialect of the Doab chiefly, and the territory around Agra and Delhi, with a mixture of Persian vocables and phrases, and a readiness to adopt foreign words. Also called *Oordoo*, i.e., the language of the Urdu, (Horde), or Camp. This language was for a long time a kind of Mahommedan *lingua franca* all over India, and still possesses that character over a large part of the country, and among certain classes. Even in Madras,

(۲۱) سید سلیمان ندوی: "نقوش سلیمانی"، اعظم گڈھ، معارف پریس، ۱۹۳۹، صفحہ ۱۰۷۔ مولانا سید سلیمان ندوی دراصل "ہندوستانی" کو اسم لسان کے طور پر "اردو" سے بہتر قرار دیتے تھے، کیوں لفظ "اردو" کے انسلاکات منفی تھے۔ اسی کتاب کے صفحات ۱۰۳ تا ۱۰۷ ملاحظہ ہوں۔

where it least prevails, it is still recognised in native regiments as the language of intercourse between officers and men. Old fashioned Anglo-Indians used to call it the Moors (q.v.) (۲۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں جو غلط باتیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں، وہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

(۱) "ہندوستانی" (یعنی "ہندی/ہندوی") زبان Upper India میں نہیں، بلکہ دہلی اور اس کے اطراف میں پیدا ہوئی۔

(۲) اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس کو صرف مسلمان ہی بولتے تھے۔ (سامنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ اس زبان کو مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا، تو ظاہر ہے کہ اس لیے ایجاد کیا کہ اس کے ذریعے وہ "مقامی" لوگوں سے گفتگو کر سکیں۔ لہٰذا اس زبان کو "مقامی" لوگ بھی بولتے ہوں گے۔)

(۳) یہ زبان ادبی حیثیت سے سب سے پہلے گجرات میں قائم ہوئی، دکن میں نہیں۔

(۴) جس "ہندی" بولی (dialect) کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اردو اس سے نکلی، اس dialect کا کوئی وجود نہیں۔ "ہندی" وہی زبان ہے جسے ہمارے فاضل مصنفین "ہندوستانی" کا نام دے رہے ہیں۔

(۵) لفظ "اردو" کے معنی ہمارے یہاں horde ("جمِ غفیر") کبھی نہیں رہے، اور نہ اس زبان کا نام "اردو" اس لیے پڑا کہ یہ کسی Camp یا لشکر گاہ کی زبان تھی۔

(۶) اگر یہ زبان صرف مسلمانی *lingua franca* (ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان) تھی، تو یہ کیوں کر ہوا کہ مدراس کے فوجیوں میں "افسروں اور جوانوں کے درمیان بول چال" کی زبان یہی تھی؟ ظاہر ہے کہ سب افسر اور جوان مذہب اسلام کے پیرو تو نہ رہے ہوں گے۔

یہ تو حال تھا "ہابسن جابسن" کا، جسے صرف انگریز اور چند ہندوستانی پڑھتے ہوں گے۔ "آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" کو تمام دنیا اختصار کی غرض سے O.E.D. کے نام سے جانتی ہے۔ اور یہ بات بھی سب مانتے ہیں کہ اوای ڈی سے بڑھ کر کوئی لغت نہ بنا ہے، اور نہ شاید بن سکتا ہے۔ علم، تحقیق، اور فصل زمانی کے لحاظ سے او ای ڈی کو "ہابسن جابسن" پر سو سے کچھ اوپر سال کی فضیلت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو اس لغت میں "ہندوستانی" کے بارے میں کیا گل کھلائے گئے ہیں۔ یہاں بھی میں اصل عبارت نقل کرتا ہوں، تاکہ کوئی اشتباہ نہ رہے:

(۲۲) "ہابسن جابسن"، ص ۴۱۷۔ مصنفین نے لفظ "ہندوستانی" کے حدوث کے مغربی شواہد درج کیے ہیں، جو ۱۶۱۶ سے ۱۸۴۸ تک کے زمانے کو محیط ہیں۔

Hindustani, Hindostanee, (hindu:'sta:ni), *a*, and *s*. Also Hindustanee, --sthanee, --stani, --stanee...The language of the Muslim conquerers of Hindustan, being a form of Hindi, with a large admixture of Arabic, Persian, and other foreign elements; also called Urdu, i.e. *zaban-urdu*, language of the camp, *sc*. of the Mughal conquerers. It later became a kind of *lingua franca* over all India, varying its vocabulary according to the locality and the local language. Also called Indostan, Indostans (cf Scots). By earlier authors sometimes applied to Hindi itself. (۲۳)

اس تحریر میں جو باتیں "ہابسن جابسن" کے علاوہ غلط ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ہندوستان کے مسلمان "فتح یاب" حملہ آور کئی تھے۔ یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ Muslim conquerors of Hindustan سے کیا مراد ہے۔ نہ یہ واضح کیا گیا کہ "ہندوستان" سے کیا مراد ہے۔

(۲) آگے چل کر کہا گیا کہ خاص کر یہ زبان "مغل فاتحوں" کی لشکر گاہ کی زبان تھی۔ یہ بات سراسر غلط بھی ہے، اور اوپر کے بیان سے متناقض بھی۔

(۳) جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ بات بھی غلط ہے کہ "اردو" نام اس لیے پڑا کہ یہ کسی لشکر گاہ کی زبان تھی۔

(۴) "پرانے مصنفوں" نے اس زبان کو "ہندی" سے متحد نہیں قرار دیا، بلکہ اس ہی زبان کا نام "ہندی" تھا۔ یہاں "ہندی" سے مراد جدید ہندی نہیں، بلکہ وہی زبان ہے جس کا نام بعد میں "اردو" ہوا، اور جسے انگریزوں نے "ہندوستانی" کہہ کر پکارنا چاہا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے وہ "ہابسن جابسن" کے مرتبین ہوں، یا اوای ڈی کے علما، دونوں نے لفظ "ہندوستانی" کی تعریف انگریزی ادراکات، یا انگریزی سیاسی پالیسی کے اعتبار سے لکھی ہے: انگریزوں کی نظر میں "ہندوستانی" اور "ہندی" دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ ہندوؤں کے لیے "ہندی"، اور مسلمانوں کے

(۲۳) ملاحظہ ہو: *The Compact Oxford Dictionary*, Second Edition, Complete Text Reproduced Micrographically, Oxford, 1993, p. 769. اس ڈکشنری میں لفظ "ہندوستانی" کے حدوث کے انگریزی شواہد پیش کیے گئے ہیں، جو ۱۶۱۶ تا ۱۸۷۸ کے زمانے کو محیط ہیں۔ آخری اقتباس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "ہندوستانی یا اردو کوئی علاقائی بولی نہیں ہے، بلکہ لنگوا فرانکا ہے۔"

لیے "ہندوستانی"۔

اسم زبان کے طور پر "ہندوستانی" کبھی مقبول نہ ہوا۔ مقامی بولنے والوں کی نظر میں اس زبان کا نام "ہندی"، یا "ریختہ" تھا، اور وہ اسی پر قائم رہے۔ لیکن دیکھیے ڈاکٹر جان گلکرسٹ صاحب کس شان سے فرماتے ہیں:

> میں نے اپنی انگریزی ہندوستانی ڈکشنری میں اس زبان کی تفصیلات کافی و وافی حد تک مہیا کر دی ہیں، یعنی جس حد تک کوئی یورپی مصنف ان سے کوئی سروکار رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اب میں اس سے آگے بیان کرتا ہوں کہ "ہندوستان" (Hindoostan) ایک مرکب لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں "ہندوؤں کا ملک" یا "تیگر و لوگوں کا ملک"۔ اور اس ملک کے بارے میں کافی معلومات لوگوں کے پاس ہیں، لہٰذا یہاں اس پر کچھ مزید بیان غیر ضروری ہے۔ اس ملک کے خاص باشندے ہندو اور مسلمان ہیں۔ ان کو، اور ان کی زبان کو بھی، ہم بے کھٹکے ایک عمومی، جامع، اور مانع اصطلاح "ہندوستانی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اس اصطلاح کو میں نے مندرجہ بالا، اور مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اختیار کیا ہے۔
>
> اس ملک کا نام، اور اس کی مقامی زبان، دونوں ہی جدید ہیں۔ لہٰذا جب میں اول اول اس زبان کے مطالعے اور مشق میں مشغول ہوا، تو مجھے اس زبان کے لیے "ہندوستانی" سے زیادہ مناسب نام کوئی نہیں معلوم ہوا۔ بے شک یہاں کے رہنے والے، اور دوسرے لوگ بھی، اسے "ہندی" یعنی Indian کہتے ہیں، گویا اس نام کو "ہند" سے مشتق کرتے ہیں، جو کہ India کا قدیمی نام ہے۔ لیکن اس نام میں مشکل یہ ہے کہ اس سے "ہندووی" (Hinduwee)، یا "ہندو ای" (Hindoo'ee)، "ہندوی" (Hindvee)، کا التباس ہو سکتا ہے۔ اور یہ الفاظ "ہندو" سے مشتق ہیں۔ لہٰذا میں اپنی پرانی رائے پر قائم ہوں، کہ اس ملک کی عوامی زبان کے لیے ہمیں اور سب نام مستقلاً ترک کر دینے چاہئیں۔ اور وہ بے معنی نام Moors بھی ترک کر دینا چاہیے۔ ان سب کی جگہ ہمیں صرف "ہندوستانی" کہنا چاہیے۔ یہاں کے لوگ اس زبان کو "ہندوستانی" کا نام دیں یا نہ دیں، [اس کی

> کوئی اہمیت نہیں] کیوں کہ ان لوگوں میں امتیاز کی صلاحیت مناسب درجے کی نہیں ہے۔ اور اگر اس طرح کے مناسبات اور پابندیاں ان کی توجہ میں لائی بھی جائیں تو وہ ان کو عمل میں نہیں لا سکتے۔ "ہندوی" (Hinduwee) کو میں بلا شرکت غیرے ہندوؤں کی ملکیت قرار دیتا ہوں۔ اور اسی لیے اس اصطلاح کو میں نے ہمیشہ ہندوستان کی قدیم زبان کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے حملے کے پہلے یہاں مستعمل تھی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت [فارسی، عربی، اور ہندوی کے درمیان] یہ زبان ہی "ہندوستانی" کی بنیاد یا زمین کا کام کرتی ہے۔ "ہندوستانی" ایک نسبتاً تازہ بالائی تعمیر ہے، جو فارسی اور عربی پر مشتمل ہے۔
>
> ان دو مؤخر الذکر کا وہی رشتہ "ہندوستانی" سے قرار دینا چاہیے جو لاطینی اور فرانسیسی کا انگریزی سے ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ "ہندوی" کا جدید "ہندوستانی" سے وہی تعلق ہے جو سیکسن (Saxon) کا جدید انگریزی سے ہے۔
>
> اس کو حسب ذیل نقشے کے ذریعہ بیان کر سکتے ہیں:
>
> سیکسن -- لاطینی -- فرانسیسی -- انگریزی
>
> ہندوی -- عربی -- فارسی -- ہندوستانی (۲۴)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہمارے گلکرسٹ بہادر نے کس طرح ہنستے کھیلتے اور کس انداز بے پروائی سے یہ اعلان کر دیا کہ وہ مقامی باشندوں (natives) کی طرف سے فیصلہ کر سکتے ہیں، کیوں کہ بچارے native لوگوں میں اتنی سمجھ کہاں ہے کہ وہ امتیازات کو برت سکیں، اور اپنا اچھا برا خود جان سکیں۔ ہندوستانی لوگ اپنی زبان کو "ہندی" کہتے ہیں تو کہیں، لیکن انگریز کی عقل کہتی ہے کہ "ہندی" سے "ہندو" کا تاثر پیدا ہوتا ہے، اس لیے یہ نام ٹھیک نہیں۔ خود گلکرسٹ صاحب کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وہ "ہندوی" کو نہ صرف یہ کہ خاص ہندوؤں کی ملکیت قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ اسے ایسی زبان کہتے ہیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے "حملے" کے پہلے رائج تھی۔ (کون سے "حملے" سے پہلے، اس کی وہ صراحت نہیں کرتے۔) اس پر طرہ یہ کہ وہ فارسی زبان، اور اس کے بولنے والوں پر (جن میں اس زمانے میں بہت سے ہندوستانی بھی تھے) یہ جھوٹا

(۲۴) John Gilchrist, *The Oriental Linguist, An Easy and Familiar Introduction* (بقیہ اگلے صفحے پر)

الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ فارسی میں "ہندو" کے معنی "نیگرو" ہوتے ہیں۔(۲۵) گلکرسٹ کو یہ بات تو منظور ہے کہ پرانی "ہندوی" اور آج کی "ہندی" (یا گلکرسٹ کے الفاظ میں "ہندوستانی") میں وہی رشتہ ہے جو سیکسن اور انگریزی میں ہے، لیکن اس کو یہ خبر نہیں کہ "ہندوی" کوئی الگ زبان نہیں تھی، بلکہ "ہندی / ہندوستانی" کا ہی ایک نام تھی۔ اور نہ ہی اس زبان کا کوئی براہ راست تعلق مسلمان حملہ آوروں سے ہے۔

لیکن انگریز کو تو اپنی سیاست اس ملک میں رائج کرنی تھی۔ اسے حقائق سے لگاؤ تھا، لیکن اسی حد تک جس حد تک اس کے سیاسی مصالح اور حقائق میں کوئی تناقض نہ ہو۔ "ہندی" کو "ہندوستانی" کا نام دینے، اور "ہندی / ہندوی" کو ہندوؤں کی جھولی میں ڈالنے کی کوششیں گلکرسٹ کے پہلے سے ہو رہی تھیں۔ فرق بس یہ ہے کہ گلکرسٹ کی باتوں کو زیادہ مقبولیت فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے ملی۔ گلکرسٹ سے پہلے ہندوستانی زبانوں کے ایک "ماہر" نتھینیل ہل ہیڈ (Nathaniel Halhed) نے ۱۷۷۸ میں بنگالی کی ایک گرامر انگریزی میں لکھی۔ برنارڈ کون (Bernard S. Cohn) کہتا ہے:

> بنگال میں اپنے وقت کی لسانی صورت حال کے وجوہ بیان کرنے کے لیے ہال ہیڈ نے اپنی گرامر کے دیباچے میں ایک تاریخی استدلال و نظریہ تعمیر کیا۔ اس نے بنگال میں سنسکرت اور بنگالی کے علاوہ دو دیگر اہم زبانوں کی نشان دہی کی۔ ایک تو فارسی، اور دوسری "ہندستینک" (Hindustanic)۔ اس موخر الذکر کی اس نے دو قسمیں بتائیں۔ ایک تو وہ، جو سارے "ہندوستان" میں بولی جاتی تھی، اور جو بقول اس کے "بلاشبہ سنسکرت سے مشتق تھی"۔ اس زبان کا سنسکرت سے وہی رشتہ تھا جو فرانس اور اٹلی کی جدید بولیوں کا خالص لاطینی سے تھا۔ ہال ہیڈ کا

to the Hindoostanee, or Grand Popular Language of Hindoostan, (Vulgarly, But Improperly, Called the Moors); Calcutta, Printed by P. Ferris, at the Post Press, 1802 [1798], p. i.

(۲۵) جدید ہندوستان کے انگریزی پریس میں اس کی صدائے بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، وسودھا ڈالمیا کی کتاب ("بھارتیندو ہریش چندر") پر واگیش شکلا کا تبصرہ، مطبوعہ *The Book Review* نئی دہلی، بابت ماہ اکتوبر، ۱۹۹۷، ص ۲۰۔ ڈاکٹر شکلا فرماتے ہیں کہ فارسی زبان میں "ہندو" بہ معنی "nigger" ہے (گویا محض حبشی بھی نہیں، بلکہ افریقی / ہندوستانی لوگوں کے لیے وہ کلمۂ تحقیر جو انگریزوں / امریکوں نے سترہویں / اٹھارویں صدی میں ایجاد کیا تھا)۔ اس پر میرے جواب کے لیے ملاحظہ ہو، *The Book Review* نئی دہلی، بابت ماہ اپریل ۱۹۹۸، ص ص ۳۷ تا ۳۸۔

> بیان تھا کہ "ہندستینک" کی دوسری قسم کا آغاز و ارتقا مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔ وہ لوگ ہندوؤں کی زبان سیکھنے سے قاصر تھے، کیوں کہ اپنی زبان کے خالص روپ کو قائم رکھنے کے لیے انھوں [ہندوؤں] نے [اپنی زبان میں] سنسکرت کے الفاظ کثیر سے کثیر تعداد میں داخل کر لیے تھے۔ ادھر مسلمان "حملہ آوروں" نے طرح طرح کے "عجیب اور غیر مانوس" الفاظ اپنی زبانوں سے لے کر [مقامی زبان میں] داخل کرنا شروع کیے۔ ان الفاظ کو مسلمانوں نے "اصل ہندستینک کے نحوی اصولوں پر اوپر سے ڈال دیا۔" ہال ہیڈ کا بیان ہے کہ ہندستینک کا یہ روپ ایک ملواں محاورہ تھا، جسے وہ ہندو بولتے تھے جو مسلمانوں کے درباروں سے متعلق تھے۔ دوسری طرف، وہ "برہمن اور دوسرے تعلیم یافتہ" ہندو تھے "جن کی جاہ پرستی ان کے اصولوں پر غالب نہ آئی تھی۔" یہ لوگ "ہندستینک" کا خالص روپ لکھتے اور بولتے تھے۔ ان کا رسم خط عربی کے بجائے ناگری حروف پر مبنی تھا۔(۲۶)

اس مجموعہ خرافات پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ یہاں ہم گلکرسٹ کی شاہانہ تجاویز کا ہی نہیں، بلکہ فیلن (۱۸۶۶) سے لے کر پلیٹس (۱۸۸۴)، "ہابسن جابسن" (۱۸۸۶)، اور اوای ڈی (۱۹۹۳) میں بیان کردہ "اردو" اور "ہندوستانی" کی تعریفوں کا سرچشمہ دیکھ سکتے ہیں۔(۲۷) یہاں ہم گلکرسٹ کی پر اعتماد پیشین گوئی کی بھی بنیاد دیکھ سکتے ہیں۔ گلکرسٹ نے ۱۷۹۸ میں کہا تھا:

> ... بالآخر یہ ہوگا کہ ہندو لوگ قدرتی طور پر "ہندوی" کی طرف جھکیں گے، اور

(۲۶) ملاحظہ ہو رنجیت گوہا کی مرتب کردہ محولہ بالا کتاب میں برنارڈ کون کا مضمون، ص ۲۹۸۔

(۲۷) میں "ہابسن جابسن" کا حوالہ اوپر دے چکا ہوں۔ اب ملاحظہ ہو ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن صاحب اپنی ڈکشنری میں لفظ "اردو" کے معنی کیا بیان کرتے ہیں:

An army, a camp; a market. *urdu,i mu'alla*, the royal camp or army (generally means the city of Dihli or Shahjahanabad; and *urdu'i mua'alla ki zaban*, the court language). this term is very commonly applied to the Hindustani language as spoken by the Muslims of India proper.

مندرجہ بالا اقتباس فیلن کی ڈکشنری (اشاعت اول ۱۸۶۶) کے یو پی اردو اکیڈمی ایڈیشن، ۱۹۸۷، کے (بقیہ اگلے صفحے پر)

مسلمان، لامحالہ عربی اور فارسی کی بیچ کریں گے۔ اس طرح، دو اسلوب جنم لیں گے...(۲۸)

یہ بات الگ ہے کہ گلکرسٹ کی پیشین گوئی تقریباً صحیح ثابت ہوئی۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ یہ پیشین گوئی جن بنیادوں پر قائم تھی وہ اخلاقی اور تاریخی دونوں اعتبار سے بالکل جھوٹی تھیں۔ چونکہ گلکرسٹ صاحب کی عقل برتر بھی "ہندوستانی" کو اس زبان کی حیثیت سے قائم کرنے میں ناکام

صفحہ ۸۷ سے لیا گیا ہے۔ اب پلیٹس کی ڈکشنری (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۴، ص ۴۰) کا اقتباس ملاحظہ ہو:

Army; Camp; market of the camp; *s.f. (urdu zaban)*, The Hindustani language as spoken by the Mohammadans of India, and byHindus who have intercourse with them or who hold appointments in the Government courts & c. (It is composed of Hindi, Arabic, and Persian, Hindi constituting the back bone, so to speak):--*urdu-i-mu'alla*, The royal camp or army (generally means the city of Delhi or Shahjahanabad); the court language (=*urdu-i-mu'alla ki zaban*); the Hindustanai language as spoken in Delhi.Compact Edition, 1993, p. 2203)

جہاں تک سوال "آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" (O.E.D.) کا ہے، تو اس میں "اردو" اور "ہندوستانی" کو ایک ہی چیز بتایا گیا ہے۔ اور آگے چل کر "ہندوستانی، جو لنگوا فرانکا ہے"، اور اردو، "جو پاکستان کی سرکاری زبان ہے" کے درمیان فرق کیا گیا ہے! منطقی تضادات کو لاپروائی سے دبا کر چپٹا کر دینے اور نظر سے غائب کر دینے کی کوششوں کی اس سے بہتر مثالیں ملنا مشکل ہوگا۔

گلکرسٹ بچارے کو تو پھر بھی کبھی کبھی کچھ شکوک و شبہات لاحق ہو جاتے تھے، اور وہ حقائق کی تعبیر اپنے معتقدات کے موافق بنانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ چنانچہ اپنی *A Dictionary, English and Hindoostanee*, (Calcutta, 1790) میں اس نے دعویٰ کیا کہ سنسکرت کا سرچشمہ "ہندوی" (Hinduwee ہے)، اور "ہندوی" وہ زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد کے پہلے سارے ہندوستان میں بولی جاتی تھی! اس نے مزید یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے بار بار کے حملوں کے نتیجے میں وہ زبان پیدا ہوئی جس کی "فوجی" صورت کو مسلمانوں میں "اردوے" (Urduwer) کہا جاتا ہے۔ اس کی "ادبی" صورت کو مسلمان "ریختہ" (Rekhtu) کہتے ہیں، اور ہندوؤں کی، عام بول چال والی، زبان کی شکل میں اسے "ہندی" (Hindee) کہا جاتا ہے!! (ملاحظہ ہو رنجیت گوہا کی مرتب کردہ محولہ بالا کتاب میں برنارڈ کون کا مضمون، ص ۳۰۴)۔ گلکرسٹ صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ "اردوے" کوئی لفظ نہیں۔ ایک مرکب کا آدھا حصہ ہے۔ "ہندی" زبان کی خیالی درجہ بندی بھی ملاحظہ ہو: فوجی زبان = اردوے؛ ادبی زبان = ریختہ؛ اور ہندوؤں کی زبان = ہندی۔ اس مبلغ علم پر بچارے گلکرسٹ صاحب ہندوستانیوں کو ان کی زبان کے نکات سکھانے چلے تھے۔

(۲۸) ملاحظہ ہو، گلکرسٹ، "گرامر"، ص ii۔

رہی تھی، اس لیے انگریزوں نے مجبوراً اسے ترک کر دیا۔ اور انھیں ایک نعم البدل بھی مل گیا۔ "اردو" ایک ایسا نام تھا جس ہندویت کی بو دور دور تک نہ تھی۔ اس کے علی الرغم، چونکہ یہ لفظ ترکی الاصل تھا، اس لیے اس کے مسلمانی رشتے واضح تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، شاہ جہاں آباد شہر کو لوگ رفتہ رفتہ "اردوے معلیٰ" کہنے لگے تھے، اور جو زبان وہاں بولی جاتی تھی، اسے "زبان اردوے معلیٰ" کہا جاتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ خان آرزو نے ۱۷۵۰ کے آس پاس فارسی کو "زبان اردوے معلیٰ" بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے خان آرزو کی ایک اور کتاب "داد سخن" کا حوالہ دیا ہے۔ میں اس کتاب سے واقف نہیں ہوں، لیکن ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں کہ اس میں ایک جگہ خان آرزو نے "شعر ریختہ" کی تعریف میں لکھا ہے کہ یہ وہ شاعری ہے جو "زبان ہندی اہل اردوے ہند" میں "غالباً [یعنی زیادہ تر] بطریق فارسی" لکھی جاتی ہے۔ (۲۹) اس بیان کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس وقت تک ہماری زبان کا نام "اردو" نہ تھا۔ ورنہ خان آرزو اسے "ہندی اہل اردوے ہند" (یعنی شاہجہاں آباد کی ہندی) کیوں کہتے؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ "ہندی اہل اردوے ہند" کہہ کر خان آرزو اس شاعری کو شمال کی زبان تک محدود کر رہے ہیں۔ ادبی تہذیب کی طرف اشارے کے طور پر، اس سلسلے میں میر کی "نکات الشعرا" کا بھی حوالہ دیکھیے جو میں نے اوپر درج کیا ہے (حاشیہ ۱۷)۔

جنوری ۱۷۷۲ کے زمانے سے، جب "ہندی" کو شاہ عالم ثانی کی عملی سرپرستی اور مشق سخن کا اعزاز نصیب ہوا، تو فارسی کے بجائے "ہندی" ہی کو "زبان اردوے معلیٰ" کہا جانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ نام گھٹ کر "زبان اردو" / "اردو کی زبان" ہوا، اور بالآخر محض "اردو" رہ گیا۔ یہ مخفف نام فوراً مقبول خاص و عام تو نہ ہوا، لیکن یہ بات انگریزوں کے لیے اہم تھی کہ لفظ "اردو" کی اصل ترکی تھی، اور ریختہ / ہندی میں لفظ "اردو" کے معنی اور چیزوں کے ساتھ ساتھ "لشکر گاہ، لشکر بازار" بھی تھے۔ اس طرح انگریزوں کے لیے یہ خیال پیش کرنا آسان تھا کہ ہندی / ریختہ کی پیدائش مسلمان فوجوں کی لشکر گاہوں اور لشکر بازاروں کی ہے، اور اسی لیے اس کا نام "زبان اردوے معلیٰ" ہے۔ (۳۰)

اس مفروضے کا قدیم ترین مطبوعہ منبع میر امن کا داستانی قصہ "باغ و بہار" معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، "باغ و بہار" ایک نثری قصہ ہے جو فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۱ سے ۱۸۰۴ کے دوران وجود میں

(۲۹) "نوادر الالفاظ"، ص ۳۳۔ مزید ملاحظہ ہو، حاشیہ ۱۶۔

(۳۰) اوپر درج کردہ O.E.D. کا اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں "ہندوستانی" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مسلمان فاتحوں کی زبان تھی۔

آیا۔ یہ کتاب گلکرسٹ کے زیر نگرانی لکھی گئی، اور اسے انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔(۳۱) میر امن نے لکھا ہے کہ میں نے یہ کہانی "اردوے معلّٰی کی زبان" میں لکھی ہے۔(۳۲) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھ سے "گلکرسٹ صاحب نے... فرمایا" کہ یہ قصہ:

> ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان مرد عورت لڑکے بالے خاص وعام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔(۳۳)

بعد کے صفحات میں، میر امن نے اپنے قاریوں کو "اردو کی زبان" کی "حقیقت" سے روشناس کرنے کا فریضہ یوں انجام دیا:

> ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد ورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے شہر کا بازار "اردو" کہلایا... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لا ثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔(۳۴)

مذکورہ بالا بیان جھوٹ سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ میر امن نے جو لکھا وہ انگریزوں

(۳۱) "باغ و بہار" کا متن ۱۸۰۱ تا ۱۸۰۲ کے آس پاس تیار ہوا۔ اسے ۱۸۰۳ میں پریس بھیجا گیا، اور یہ ۱۸۰۴ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے، "باغ و بہار"، مرتبہ رشید حسن خاں، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۲، ص ص ۴۳ تا ۵۰ اور ۷۹ تا ۸۰ (دیباچہ مرتب)۔

(۳۲) "باغ و بہار" ص ۲، متن۔

(۳۳) ایضاً، ص ۶، متن۔

(۳۴) ایضاً، ص ۷ تا ۸، متن۔

کے زیر اثر لکھا، اور انھیں خوش کرنے کے لیے لکھا۔ انھیں ہرگز توقع نہ تھی کہ ان کی کتاب کو کبھی ہندوستانی بھی پڑھیں گے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ وہ کتاب جو اصلاً ہندوستانی نہ تھی، اردو نثر کے مقبول ترین شاہکاروں میں شمار ہوئی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے لکھا ہے:

> [اردو کی] جو کتابیں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام تیار ہوئیں، وہ اولاً، یا اصلاً، اردو کے قاری کے لیے نہ تھیں... "باغ و بہار" کے ایڈیشن پیرس اور لندن سے تو نکلے، لیکن کلکتہ کے سوا کسی ہندوستانی شہر سے نہ شائع ہوئے... وہ ادبی کارنامے جو ہندوستانی نہیں تھے، بدیں معنی کہ وہ ہندوستانی قاری کے لیے نہ تھے، اردو نثر کے سب سے زیادہ مقبول اور کثیر القرأت کلاسک بن گئے... یہ ایسا عجوبہ ہے جس کے وجود میں آنے کی وجہ اردو نثر کے ماہرین ابھی تک بیان نہیں کر سکے ہیں (۳۵)۔

ان کا خیال تھا کہ یہ کتاب انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے ہے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ شکست خوردہ نو آبادیاتی تہذیب اس کتاب کو حرز جاں بنالے گی، اپنی نثر کی تاریخ اس سے ہی شروع کرے گی، اور یہ کتاب ہر اردو بولنے والے کے گھر میں اہم متن کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ ورنہ انھوں نے اپنی طرف سے مذکورہ بالا بیان میں کئی باتیں ایسی کہی تھیں، اور کئی اہم باتیں اس طرح ان کہی چھوڑ دی تھیں، کہ پوری عبارت کو پڑھ کر کوئی بھی محتاط اور متوجہ قاری سمجھ سکتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

مثال کے طور پر:

(۱) میر امن نے محمود غزنوی، غوری، اور لودیوں کا ذکر یوں کیا ہے گویا یہ سب ایک دوسرے کے متصل تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰) سے محمد غوری (وفات ۱۲۰۶) تک پونے دو سو برس ہیں۔ اور پھر غوری سے لے کر پہلے لودی سلطان بہلول لودی (زمانۂ حکومت کا آغاز ۱۴۵۲) تک ڈھائی سو برس کا فصل ہے۔ تیمور ان سے بہت پہلے (۱۳۹۸) یہاں آکر جا چکا تھا۔

(۲) میر امن لکھتے ہیں کہ "امیر تیمور کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا آتا ہے"۔ گویا

(۳۵) Sadiq-ur-Rahman Kidwai: *Gilchrist and the "Language of Hindoostan"*, New Delhi, Rachna Prakashan, 1972, pp. 31-32

تیمور (۱۳۹۸) سے تادم تحریر (۱۸۰۱) ایک ہی گھرانے کی حکومت رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ محمود غزنوی سے لے کر شاہ عالم ثانی تک کئی انفصال ہیں۔ تسلسل بالکل نہیں۔ لہٰذا اردو کی کہانی کو بادشاہوں (اور شاہان مغلیہ) کی کہانی سے مربوط کرنے کے لیے ایک فرضی تسلسل قائم کیا جارہا ہے۔

(۳) تیمور اور اکبر کے درمیان بھی کئی انفصال ہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اکبر کبھی دہلی میں رہا ہی نہیں۔ دہلی اور اکبر کا قریب ترین علاقہ ہیمو سے جنگ کے دوران ہوا تھا (۱۵۵۶)، جب اکبر اور اس کی افواج دہلی سے کوئی پچاس میل دور پانی پت میں صف آرا ہوئیں۔

(۴) سب سے اہم بات یہ کہ میر امن نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ جس زبان میں وہ قصہ "باغ و بہار" لکھ رہے ہیں، قدیم الایام سے اس کا نام "ہندی / ہندوی" ہے، اور ان کے اپنے زمانے میں اس کا مقبول ترین نام "ہندی" ہے۔

یہ سب ایک طرف رہا۔ درسی کتاب کی حیثیت سے "باغ و بہار" کی غیر معمولی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر امن کے قصے کو ہر مفہوم میں مقبولیت اور قبولیت عام نصیب ہوئی۔ سنجیدہ ماہرین لسانیات، مثلاً گریرسن، بھی اس دھوکے میں آگئے کہ "اردو" ایک ملغوبہ ہے، مختلف قبائل اور گروہوں کی بولیوں کا۔ گریرسن نے بعد میں اس خیال کی تردید کی۔ اس نے لکھا:

> یہ بات قارئین کی نظر میں ہوگی کہ یہاں [یعنی زیر نظر کتاب میں، موجودہ مقام پر] ہندوستانی کے آغاز کی روداد جو میں نے بیان کی ہے، وہ ان بیانات سے بہت مختلف ہے جو مختلف مصنفین (بشمول راقم الحروف) نے اس موضوع پر اس سے پہلے سپرد قلم کیے ہیں۔ ہمارے گذشتہ بیانات میر امن کے دیباچہ "باغ و بہار" پر مبنی تھے۔ میر امن کی رو سے اردو، متنوع قبائل کی زبانوں کا غیر اصیل ملغوبہ تھی، اور یہ قبائل وہ تھے جو دہلی کے بازار میں جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ (۳۶)

گریرسن نے بھی بات پوری طرح صاف نہ کی تھی، کیوں کہ میر امن نے زبان کا نام "اردو" نہ لکھا تھا، بلکہ "اردو" [یعنی دہلی] کی زبان" لکھا تھا۔ گریرسن خود اس زبان کو کبھی "ہندوستانی"، کبھی "اردو" کہتا ہے۔

(۳۶) Sir George Abraham Grierson: *Linguistic Survey of India*, Vol. IX, Part I, Calcutta, Superintendent, Government Printing, India, 1916, P. 44

لہٰذا گریرسن بھی اس بات کو کھل کر تسلیم نہیں کرتا کہ اس زبان کا صحیح نام "ہندی" تھا، اور "ہندوستانی"، یا "اردو"، وہ نام ہیں جو انگریزوں کے موافق مزاج تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ میر امن پر تو الزام دھرتا ہے، لیکن یہ بتانا بھول جاتا ہے کہ گلکرسٹ نے بھی اردو کو "ملواں زبان" (mixed language) بتایا تھا۔

لیکن "ہندی" اور "اردو" کو دو مختلف زبانوں کے ناموں کی حیثیت سے قائم ہوتے بہت دیر لگی۔ "اردو" نام کے خلاف اس زبان کے بولنے والوں کی مقاومت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نام کے ذریعے خود اس زبان کے آغاز اور نوعیت کے بارے میں باطل تصورات ذہن میں خواہ مخواہ پیدا ہوتے تھے۔ (۳۷) ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے انھیں باطل تصورات کا شک پیدا ہونے کی بنا پر یہ تجویز رکھی تھی کہ "اردو" کا نام "ہندوستانی" رکھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ "ہندی" اس وقت تک ایک مختلف زبان کی حیثیت سے قائم ہو چکی تھی، اس لیے علامہ کے زمانے میں یہ نام اہل اردو کو میسر نہ ہو سکتا تھا، ورنہ وہ شاید "ہندی" ہی نام رکھنے کے حق میں سفارش کرتے۔ (۳۸)

لکھنؤ کے ایک طبیب اور شاعر احمد علی خاں یکتا نے ۱۷۹۸ میں، یا اس کے کچھ قبل، ایک تذکرہ نما کتاب "دستور الفصاحت" لکھی۔ انھوں نے ۱۸۱۵ میں اس میں کچھ اضافے کیے۔ (۳۹) یہ کتاب یوں تو اردو صرف و نحو کے بارے میں ہے، لیکن اس میں کچھ اہم شعرا کے حالات بھی ہیں، اور ایک نہایت قابل قدر دیباچہ ہے۔ (وہ اس زبان کے نام کے لیے "ہندی" اور "اردو" دونوں لفظ استعمال کرتے ہیں۔) یہ کتاب انھوں نے لکھنؤ میں، انگریزوں کے اثر و رسوخ سے بہت دور، لکھی۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے اردو زبان

(۳۷) گلکرسٹ کے بہت بعد بھی، غالب کو لفظ "اردو" کو بطور اسم لسان استعمال کرنے میں تکلف تھا۔ انھوں نے شیو نرائن آرام کو ایک خط میں لکھا (مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸) کہ "میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا"۔ ("غالب کے خطوط"، جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۷، ص ۱۰۶۷)۔ غالب نے "اردو" کو مذکر لکھا ہے، جب کہ اسم لسان کے طور پر یہ مونث، اور "لشکر بازار / لشکر گاہ" کے معنی میں یہ مذکر ہے۔ یعنی اس زمانے تک "اردو" بطور اسم لسان بہت مقبول نہ ہوا تھا۔ مصحفی کا شعر ہم اوپر دیکھ چکے ہیں (حاشیہ ۱۰) جہاں لفظ "اردو" مذکر ہے، لیکن زبان کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ محمد حسین آزاد کو غالب کے عیب نکالنے میں بظاہر لطف آتا تھا۔ انھوں نے ("آب حیات"، مطبوعہ کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۶۷، [۱۸۸۰] ص ۶۱۳) اس بات کو اعتراض کا ہدف بنایا ہے کہ غالب نے "اردو" بطور اسم لسان مذکر استعمال کیا ہے۔ انھیں یہ خیال نہ رہا کہ لفظ "اردو" بطور اسم لسان وسط انیسویں صدی میں مقبول نہ تھا۔

(۳۸) علامہ سید سلیمان ندوی: "نقوش سلیمانی"، ص ص ۱۰۱ تا ۱۰۲۔ یہ مضمون اشاعت سے قبل، ۱۹۳۷ میں لکچر کے طور پر پیش کیا تھا۔

(۳۹) احمد علی خان یکتا: "دستور الفصاحت"، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، رضا لائبریری، ۱۹۴۳، ص ۲۷ (دیباچہ مرتب)۔

کے آغاز پر جو کلام کیا اسے اس موضوع پر کسی باعلم اہل اردو کی پہلی مطبوعہ تحریر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یکتا نے لکھا:

> اور اس زبان نفیس کے حدوث کا سبب یہ ہے کہ جب سواد اعظم ہندوستان، اور اس زمین منفعت بنیان کے منافعات دوسری اقلیم کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں، اور اس ملک کی زرریزی دنیا میں ہر طرف ظاہر اور بے حد مشہور ہے، اور اس ملک کے امرا اور سلاطین کا مرتبہ، شوکت اور ثروت، ہمت اور سخاوت میں دوسری اقالیم کے عمائد دولت اور ارکان سلطنت سے زیادہ ٹھوس اور بلند ہے، تو یہ لازم ہوا کہ دانایان دہر، اور عاقلان عصر، اور ہر فن و ہنر کے کاملین، اور فاضل و عالم، شعرا اور شرفا، دنیا میں جہاں جہاں تھے اور جس طرف تھے، انھوں نے اس سواد اعظم مراد توام کا رخ کیا اور اپنے دلخواہ مقاصد اور مرادوں کو پہنچے۔ اور ان میں سے اکثر نے اس زمین ارم تزئین کو اپنا وطن قرار دے لیا۔ اس طرح، دربار میں ان کی آمد و شد، اور اس دیار کے لوگوں کے ساتھ معاملات درپیش ہونے کے باعث انھیں اس زبان میں گفتگو کے علاوہ چارہ نہ تھا۔
>
> یہ ناگزیر ہوا کہ ان کی صحبتیں اُن سے، اور اُن کی صحبتیں ان سے پیش آنے کے دوران، اثنائے گفتگو میں، لوگوں نے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ ضرورت بھر سیکھ لیے۔ اور جب یہ معاملہ ایک مدت تک رہا، اور اس پر ایک عمر صرف ہو گئی، تو ایک دوسرے کی زبان سے الفاظ اور کلمات کے ارتباط و امتزاج کے نتیجے میں وہ صورت پیدا ہوئی کہ جسے ایک نئی زبان کہا جا سکتا تھا۔ اب نہ عربی، عربی رہی، اور نہ فارسی ہی فارسی رہی۔ اور اسی پر قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ تمام بولیاں بھی جو ہندی زبانوں میں شامل ہیں، اپنی اصل پر نہ رہیں۔ لیکن اس وقت بھی ایک نحو واحد، جیسا کہ ہونا چاہیے، نہ قرار پائی تھی۔ اور اس زبان نے وہ مرتبہ فصاحت نہ حاصل کیا تھا جو اسے اب میسر ہے... اور ہر قوم اپنے محاورے کو دوسرے کے محاورے پر ترجیح دیتی تھی۔ (۴۰)

(۴۰) ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب ہفتم، "نئے زمانے نئی ادبی تہذیب"۔

آگے چل کر یکتا نے لکھا کہ "ناچار، عقلا اور داناؤں" نے ایک معیاری روزمرہ اور محاورہ متعین کیا۔ اس کے شرائط میں حسب ذیل باتیں شامل تھیں:

> کلمات سنجیدہ و الفاظ پسندیدہ، ہر زبان اور ہر محاورے سے، جیسا کہ ہونا چاہیے، صحت اور درستی کے ساتھ اخذ کیے جائیں، اس طرح کہ اپنی آسانی کے باعث مفید مطلب ہوں، اور زبان کے تنافر اور ثقالت سے دور ہوں... گفتگو پایۂ فصاحت و بلاغت سے ساقط نہ ہو۔ بلکہ بہت صاف، مانوس طبع، اور ہر شریف آدمی اور معمولی آدمی کے لیے قریب الفہم ہو... لیکن شروط مذکورہ کے ساتھ یہ زبان بعض باشندگان شاہجہاں آباد کے علاوہ کسی کے پاس ہے نہیں۔ اور یہ لوگ وہ ہیں جو فصیل شہر مذکور کے اندر سکونت گزیں ہیں۔ یا پھر وہ لوگ ہیں، جو مذکورہ بالا بزرگواروں کی اولاد ہیں، اگرچہ کچھ عرصے سے یہ صاحبان یا ان کی اولادوں نے شہر چھوڑ کر اور جگہوں پر اقامت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اسی طرح ان اہل لکھنؤ کی زبان ہے جو قدیم الایام سے اس شہر [لکھنؤ] کے باشندے نہیں ہیں، زمانۂ گذشتہ میں وہاں نہ تھے۔ فی الوقت ان لوگوں کی زبان، دوسروں کے مقابلے میں فصاحت سے قریب تر ہے۔ (۴۱)

یکتا کے مندرجہ بالا بیانات اس لسانی خوبی کے تصور سے بالکل ہم آہنگ ہیں جو دہلی والوں نے ریختہ / ہندی شاعری کے دہلی میں مقبول ہوتے ہی اپنے لیے مختص کر لی تھی (۴۲)۔ دہلی والوں نے سیاسی دارالخلافہ کا باشندہ ہونے کے زعم میں یہ فیصلہ کر لیا کہ انھیں ہندی / ریختہ کا لسانی دارالخلافہ بھی ہونے کا اختیار ہے۔ چنانچہ جلد ہی یہ بات کم و بیش طے شدہ مان لی گئی کہ دہلی کی ادبی تہذیب اور ریختہ کی ادبی تہذیب ایک ہی شے ہیں۔ انگریزوں کے لیے اس میں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن "اردو" کے آغاز کے بارے میں نظریات، یا افسانوں، کا معاملہ اور تھا۔

یکتا نے اردو / ہندی زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں، وہ ان کے زمانے کے پڑھے

(۴۱) یکتا، ص ۵ تا ۶ [متن]۔

(۴۲) ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب ہفتم، "نئے زمانے نئی ادبی تہذیب"۔

لکھے اہل زبان (مادری زبان کی حیثیت سے اس زبان کو بولنے والوں) کے مشترک اور مقبول ادراک پر مبنی رہی ہوں گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تصورات اور ادراکات کسی بھی صورت سے "مسلمان حملہ آوروں اور فاتحوں" کے بارے میں افسانوں سے مطابقت نہ رکھتے تھے، کہ یہ زبان تو "حملہ آوروں اور فاتحوں" کی زبان تھی، اور اس زبان کو صرف ان ہندوؤں نے بدرجۂ مجبوری قبول کیا تھا جو مسلمانوں کی ملازمت میں تھے۔ یکتا کو لسانیات، یا تاریخی، یا تقابلی لسانیات، میں درک نہ تھا (یہ فنون اس زمانے میں موجود بھی نہ تھے) لہٰذا انھیں اس بات کی خبر نہ تھی کہ وہ بولی، جسے بعد کے لوگوں نے "کھڑی بولی" کا نام دیا، اور "ہندی / اردو" جس کی ترقی یافتہ شکل ہے، شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کے پہلے سے موجود تھی۔ مسلمانوں نے صرف یہ کیا کہ اس بولی کو مستقل زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کیمیائی ایجنٹ کا کام کیا۔ لیکن یہ باریک باتیں تو لسانیات کے علما کی دلچسپی کی ہیں۔ اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں احد علی خاں یکتا کا بیان عمومی طور پر درست ہے۔ اور یہ بیان میرامن کی انگریز پسندیدہ کہانی سے تمام اہم معاملات میں مختلف ہے۔

اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ خود ہندوؤں نے، جن کی "بھلائی" کی خاطر ایک پوری نئی لسانی روایت انیسویں صدی میں وضع کی جا رہی تھی، اس نئی تشکیل کو کچھ بہت خوشی سے نہ قبول کیا۔ بلکہ شروع شروع میں تو بہت سے ہندوؤں کا رویہ اس نئی زبان کی طرف معاندانہ تھا۔ کرسٹوفر کنگ (Christopher King) کہتا ہے کہ یوپی میں ۱۸۵۰ تک بھی "پڑھے لکھے ہندوؤں کا ایسا طبقہ نہ پیدا ہوا تھا جس کی وابستگی کھڑی بولی / ہندی کی اس تسلسلی وضع سے تھی، جس کی بنا پر وہ خود کو اردو بولنے والوں سے الگ قرار دے سکتے تھے"۔ کنگ کا کہنا یہ بھی ہے کہ وسط انیسویں صدی میں "اگر ہم سنسکرت کی روایت میں تعلیم پائے ہوئے ہندوؤں کے ایسے بیانات سے دوچار ہوں جن میں کھڑی بولی کے اس نئے طرز [یعنی انگریزوں کی بنائی ہوئی جدید ہندی] کے وجود سے انکار کیا گیا ہو، تو یہ کچھ حیرت کی بات نہ ہوگی۔" اس کے بعد وہ حسب ذیل واقعہ بیان کرتا ہے:

> بنارس کالج کے شعبۂ انگریزی کے صدر ڈاکٹر جے آر بیلن ٹائن (J.R.Ballen-tyne) نے ۱۸۴۷ میں یہ تہیہ کیا کہ سنسکرت کالج کے طلبہ کا طرز و اسلوب اس زبان میں بہتر بنایا جائے جسے ڈاکٹر بیلن ٹائن "ہندی" کا نام دیتے تھے۔ (ملحوظ رہے کہ بنارس کالج کا قدیم تر حصہ سنسکرت کالج ہی تھا)... انھوں نے حکم دیا کہ میرے کچھ طالب علم "ہندی" میں مشقیں لکھیں...

> لیکن اس حکم کے بارے میں جس قسم کی مسلسل مقاومت اور عدم دلچسپی کا سامنا بیلنٹائن کو کرنا پڑا، اس سے تنگ آ کر انھوں نے طلبہ کو حکم دیا کہ تم سب مل کر ایک مضمون لکھو جس میں یہ واضح کرو کہ "تم لوگ تاحین حیات جو زبان روزانہ بولتے ہو، اس کی تہذیب کو تم نگاہ حقارت سے کیوں دیکھتے ہو، درحالے کہ تمھاری مائیں اور بہنیں اس زبان کے علاوہ کسی بھی زبان کو سمجھ نہیں سکتیں؟"...
>
> بالآخر ان طالب علموں اور ڈاکٹر بیلنٹائن کے درمیان ایک مکالمہ وجود میں آیا۔ اور اس مکالمے کے ذریعے یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ کسی معیار بند ادبی بولی کی حیثیت سے "ہندی" زبان کا ان طالب علموں کو کوئی علم نہ تھا۔ انھوں نے کہا:
>
> "ہماری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ آپ یورپی لوگ، لفظ 'ہندی' سے کیا مراد لیتے ہیں، کیوں کہ دراصل سیکڑوں بولیاں ایسی ہیں جنھیں ہماری سمجھ کے مطابق 'ہندی' کہا جا سکتا ہے۔ اور ان بولیوں میں سنسکرت کی طرح کا کوئی تصور معیاری زبان کا نہیں ہے۔"
>
> ...اور آخری بات یہ کہ یہ طلبہ، ڈاکٹر بیلن ٹائن کی "ہندی" سے کسی قسم کی وابستگی محسوس نہ کرتے تھے۔ یا یوں کہیں کہ یہ طلبہ، اردو = ہندو + مسلمان کی مساوات کو قبول کرتے تھے... یہ رویے اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں جب ہم اس بات کا احساس کریں کہ پانچ دہائی بعد اسی کالج کے طلبہ نے "ہندی" اور ناگری رسم الخط کو فروغ دینے کی غرض سے ناگری پرچارنی سبھا کی بنا ڈالی۔ (۴۳)

یہ بات، کہ انگریز بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، اب تاریخ کا حصہ ہے۔ اور یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ انگریزوں کے مقصود کی پشت پر نوآبادیاتی حاکم کی رعونت اور سیاست تھی۔ اسی طرح، یہ بات بھی اب تاریخ کا حصہ ہے کہ اس مقصود کے حصول نے "ہندی / ہندو" تشخص کی وحدت کے بارے میں

(۴۳) کرسٹوفر کنگ: ص ص ۹۰ تا ۹۱۔

ایک خاص طرح کے عقیدے کو جنم دیا، اور اس کے باعث پر جوش جذبات اور گرم منصوبے ہماری ادبی اور لسانی تہذیب میں در آئے۔(۴۴)

(۴۴) وسودھا ڈالمیا نے گریرسن کا قول نقل کیا ہے کہ "وہ عجیب و غریب، مزے دار، ملواں (hybrid) زبان، جسے اصحاب یورپ 'ہندی' کے نام سے جانتے ہیں"، دراصل "خود یورپی لوگوں" کی ہی "ایجاد کردہ" ہے۔

ڈالمیا مزید کہتی ہیں کہ "گذشتہ صدی کی ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۰ والی دہائی آتے آتے "ہندی کے قوم پرست حامی" جو "ہندی کے آغاز کے بارے میں اساطیر اور شجرے خلق کرنے میں مصروف تھے"، اس بات کو نہایت "لغو" قرار دیتے کہ "ان کی زبان کوئی مصنوعی، موضوعی شے ہے۔" انھیں اس بات پر یقین تھا کہ "ہندی، شمالی ہند کی وسعتوں میں، تمام گھروں میں بولی جاتی تھی، اور یہ صورت حال مسلمانوں کے حملے کے پہلے سے تھی... جیسا کہ اکثر ہوا ہے، قوم پرستوں اور سامراجیوں میں کم از کم اس ایک بات پر اتفاق رائے تھا، یعنی: ہندوؤں کی اپنی ایک زبان ہے، اور یہ زبان انھیں آج ہی کے مسلمانوں سے نہیں، بلکہ زمانۂ گذشتہ کے بھی مسلمانوں سے ممیز کرتی تھی۔ دونوں میں اختلاف تھا تو بس اس بات کا، کہ انگریزوں کا دعویٰ اور زور اپنے بارے میں تھا، کہ ہم نے یہ زبان خلق کی۔ یہ ہمیں تھے جنھوں نے اس کو مسلمانی ملبے سے نکالا، وہ سارا ملبہ جو اس کے اندر اور چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ اس کے برخلاف، ہندوؤں کو اگرچہ یہ بات تسلیم تھی کہ اس [جدید] ہندی زبان میں کوئی ادب نہ تھا، لیکن وہ یہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ اس زبان کا تسلسل قدیم الایام سے تھا۔"

ملاحظہ ہو وسودھا ڈالمیا کی کتاب، جسے ہندی کے حلقوں میں کچھ خاص تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے:

Vasudha Dalmia: *The Nationalization of Hindu Traditions: Bharatendu and Nineteenth Century Banaras;* New Delhi, Oxfor University Press, 1997, pp.149-150.

باب دوم

تاریخ کی تعمیر نو، تہذیب کی تشکیل نو

"ہندی / اردو" کی اصطلاحات کب اور کس طرح رائج ہوئیں، ان کے بارے میں کس کس طرح کے اساطیر وضع کیے گئے، اور ان کی اصل، تاریخی صورت حال کیا ہے، ان معاملات کا مندرجہ بالا مختصر بیان ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بہت سے علما اس رائے کے حامل ہیں کہ وہ زبان جسے آج ہندی کہا جاتا ہے، برصغیر کی ادبی تاریخ میں اس سارے علاقے کی حق دار ہے جو (کم از کم سترہویں صدی تک) اس زبان کے زیر نگیں تھا جسے آج ہم اردو کہتے ہیں، اور جو اس وقت تک ہندی / ہندوی / دکنی / ریختہ کہلاتی تھی۔ جہاں تک سوال برج بھاشا، اودھی، اور ان کی طرح کی دیگر جدید شمالی ہندوستانی بولیوں کا ہے، جدید "ہندی" والوں نے تقسیم ہند کے پہلے ہی سے ان کی تاریخ کو اپنی تاریخ کا ایک حصہ قرار دینا شروع کر دیا تھا۔(۱) اور جہاں تک سوال "اردو" کی تاریخ کا ہے، تو "ہندی" والوں کے یہ دعوے، کہ وہ بھی "ہندی" کی ہی تاریخ کا حصہ ہے، تقسیم ملک کے بعد شروع ہوئے۔(۲) اور آج ہندی / اردو کی تاریخ کے بارے میں کوئی بحث اس

(۱) کرسٹوفر کنگ کا کہنا ہے کہ جدید ہندی میں کھڑی بولی کی روایت چونکہ نسبتاً نو عمر ہے، اس لیے "انیسویں صدی میں ہندی کے حامیوں، اور بیسویں صدی میں ہندی کے مورخوں نے عام طور پر برج، اودھی، اور دوسری علاقائی معیاری بولیوں کو بھی قدیم 'ہندی' ادب کے مباحث میں شامل کر لیا ہے۔ اور ماضی قریب اور زمانۂ حال کے ادب سے بحث کرتے وقت وہ عام طور پر ان بولیوں کی روایت پر صرف کھڑی بولی کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا ایسا لگتا ہے کہ ایسے اساطیر کی تعمیر، جن کے ذریعے اشرافیہ طبقہ، گروہی تشخص کو قائم کرنے والی علامتوں کو قدر کا حامل سمجھتا ہے، خود ان علامتوں کے داخلی تضاد کو نظر انداز کر کے ہی ہوتی ہے۔" کنگ، ص ۲۵۔

(۲) اس سمت میں پہلا بڑا قدم غالباً ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے اٹھایا۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب "دکنی ہندی"، مطبوعہ الٰہ آباد، ۱۹۵۲۔ اس اطلاع کے لیے میں پروفیسر جعفر رضا کا ممنون ہوں۔